صلح اور جنگ: عقل وفطرت کی روشنی میں

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علیٰ سَیِّدِ الْاَنْبِیَآئِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ۔

''صلح اور جنگ'' یہ موضوع خود ہمیشہ سے خیالات کا محاذ جنگ رہا ہے اور مختلف جماعتوں کے نظریات ہمیشہ سے اس کے بارے میں جداگانہ رہے ہیں۔ اور عالمِ انسانی کا فیصلہ اس کے متعلق افراط وتفریط کے دو عملے میں گرفتار ہو گیا ہے۔ جس طرح سے سیاسی اور اجتماعی حیثیت سے اس موضوع نے ایک اہمیت حاصل کر لی ہے اور دنیا کے افکار وخیالات کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اسی طرح مذہبیات میں بھی اس نے ایک اچھی خاصی اختلافی صورت پیدا کر دی ہے۔ عیسائیوں کے یہاں انجیل مقدس میں ایک خاص طرح کی تعلیم ہے جو سراسر صلح کی دعوت دیتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اور اس سے پہلے ہمیشہ ان مذاہب کے خلاف جنھوں نے کسی موقع پر تلوار اٹھائی ہے یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ انہوں نے دنیا کے امن وامان کو صدمہ پہنچایا اور اپنے مقصد کی تکمیل کو تلوار سے انجام دیا۔

موجودہ زمانہ میں بھی اگر آپ غور کیجئے تو آپ کو متضاد خیالات نظر آئیں گے۔ ایک طرف تو ہندوستان میں جو قومی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے ہیں، یعنی گاندھی جی ان کی تعلیم ہے کہ انسان کو ہر وقت عدم تشدد سے کام لینا چاہئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود کانگریس کی تاریخ میں ایسی صورتیں پیش آئیں جو اس اصول کے یا اس تلقین کے خلاف ہوں مگر لفظی حیثیت سے اس کے اوپر زور دیا جاتا رہا ہے اور اس کے اوپر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے کہ عدم تشدد کا آلۂ کار جنگ کے سدِّ باب کے لئے بہترین چیز ہے۔ اس کی تشریح کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو بہرصورت غیر متشددانہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ یعنی کسی وقت اس کی جانب سے سختی نہ ہونے پائے اس کے علاوہ دنیا کی متمدن سلطنتیں اکثر ان میں سے صلح کی علمبردار اپنے تئیں قرار دیتی ہیں اور صلح کی تبلیغ الفاظ واعلانات کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اسی صلح کے قائم کرنے کے لئے مجلس اقوام کی تشکیل کی گئی اور مجلس اقوام کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے تمام ممالک متحد ہوں اور وہ ایسی صورتیں اختیار کریں کہ جن کے ذریعہ سے دنیا میں جنگ نہ ہونے پائے۔ اس کے لئے تخفیف اسلحہ کی تجویز پاس کی گئی کہ تمام حکومتیں اپنے اسلحہ کو کم کر دیں یہ اور بات ہے کہ اس کے اوپر عمل نہیں ہو سکا اور خود وہ لوگ اس پر عمل نہ کر سکے جو دراصل اس تحریک کے پیش کرنے والے تھے اور جو اس چیز کے مؤیدین تھے، چہ جائیکہ وہ لوگ جنھوں نے پہلے ہی اس طریقہ کار کو ٹھکرا دیا اور اس کے قبول کرنے اور اقرار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بہرحال تخفیف اسلحہ کی تجویز اسی غرض سے لائی گئی تھی کہ دنیا میں جنگ کا سدِّ باب ہو جائے اور امن وامان دنیا میں قائم ہو سکے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا نظریہ عجیب وغریب ہے یعنی ایک طرف گاندھی جی کا عدم تشدد بلا استثناء اور دوسری طرف جرمنی میں ہٹلر۔ وہاں اصول یہ ہے کہ ملک کو جنگ کے لئے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہئے۔ یعنی گویا مقصد زندگی جو ہے وہ جنگ پر منحصر ہے، صلح پر نہیں ہے۔ جرمنی کے رہنمایانِ ملک یہ تلقین کرتے رہے ہیں کہ مقصدِ حیات جنگ ہے اور یہ ایک عجیب اصول ہے جس کی وہاں

ہمیشہ سے تبلیغ ہوتی رہی۔ مگر اس پر تعجب بھی نہیں کرنا چاہئے۔ اس وقت دنیا کے فلسفہ میں ایک بہت بڑی حیثیت سمجھی جاتی ہے ارسطو کی۔ ارسطو نے اپنی کتاب میں یہ سب سے پہلے لکھ دیا ہے کہ وہ قومیں جو غلامی کی خوگر ہو چکی ہیں اور جن میں قوت مدافعت باقی نہیں رہی ہے، ان پر بزور شمشیر قبضہ حاصل کرنا انسان کا انسانی حق ہے۔ اور دراصل یہ ارسطو کی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے سکندر اعظم نے گویا یہ اپنا قانونی حق قرار دے دیا تھا کہ وہ دوسرے ممالک پر فوج کشی کر کے ان پر قبضہ کرے اور اس شریعت پر تمام ملک گیر اور فاتح سلاطین کی سنّت قائم رہی۔ جرمنی میں ہمیشہ سے اس کی تبلیغ ہوتی رہی اور اسی اصول پر اپنی قومیت کی عمارت قائم کی گئی۔ چنانچہ جرمنی کے ایک وقت میں بہت بڑے صاحبِ اقتدار حاکم فریڈرک اعظم نے بھی صاف صاف اس کا اعلان کیا ہے کہ جنگ تجارت ہے اور اس میں اخلاق کا خیال سارا کام بگاڑ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی تصورات سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم اس میں اپنے کو الجھا دیں تو کوئی کام ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جو اعلان کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے اور گویا یہ قوم کی ہر ہر فرد کی رگ وپے میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ سابق سلاطین کی ڈالی ہوئی داغ بیل تھی جس پر (ہر) ہٹلر نے عمارت قائم کی۔ اور ہر ہٹلر نے جیل خانہ میں جو ۷۰۰ صفحات کی کتاب لکھی ہے اور جس میں جرمنی کے لئے ایک زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر دیا ہے اور وہ کتاب وہاں انجیل سے زیادہ باوقعت اور قابلِ عزّت سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس نے صاف لکھا ہے کہ فطرت سیاسی حدود کی پابندیوں سے بے نیاز ہے۔ جرأت اور ہمّت میں جو انسان سر بلند ہو وہ اس کا محبوب فرزند ہے اور فطرت اس کے سر پر تاج حکمرانی رکھنے کی آرزو مند ہے، کیونکہ ایسے ہی انسان کو صرف زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ جگہ کی تنگی باشندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتی ہے، اس لئے جرمنی کو چاہیئے کہ وہ اپنے نقص کو دور کرے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے کوئی ہم کو زمین کیوں دینے لگا۔ جو چیز خوشی سے نہیں دی جاتی ہے وہ ہمیشہ چھیننے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اتحاد صلح کی غرض سے کیا جائے، اس کے معنی کوئی بھی نہیں ہیں۔ جس اتحاد کا مقصد مستقبل کی جنگ آزمائی نہ ہو، وہ بے معنی اور بے سود ہے۔ لڑنے کے لئے ہی تو اتحاد کیا جاتا ہے۔ جس میں استطاعت مدافعت نہیں اس کے ساتھ دوستی ایک قسم کا جنجال ہے۔ جو لوگ صلح کی آوازیں بلند کرتے ہیں تو یہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جماعت ہے جو فطرۃً صلح کرتی ہے اور یہ پست ہمّت اور بزدلوں کی جماعت ہے۔ دوسری جماعت آواز صلح اس لئے بلند کرتی ہے تاکہ ان کا حریف بے فکر ہو جائے اور اس کو حملہ کی تیاری میں اچھا موقع ہاتھ آ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ نسل انسانی کو جو کچھ فروغ حاصل ہوا ہے، وہ مسلسل نبرد آزمائیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے خیال میں صلح و آشتی کا تصور اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ کل ربع مسکوں ایک ہستی کے زیر فرمان ہو۔ زندگی میں پہلے لڑائی ہے، تب امکان امن ہے۔ اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ ان خیالات میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کہیں تو حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں یہ تعلیم کہ کوئی ایک رخسارہ پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا رخسارہ بڑھا دو۔ یعنی کبھی نہ لڑو اور آپ کے ہندوستان میں بہت سی ایسی جماعتیں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں جو کسی وقت میں بھی جنگ کو اچھا نہیں سمجھتیں۔

بعض مذاہب تو ایسے ہیں کہ جن میں کسی ذی روح کا خون بہانا نہ چاہئے، چاہے وہ اپنے کو ایذا بھی پہنچائے۔ یعنی وہ جانور جو انسان کو تکلیف پہنچاتا ہے، اس کا قتل کرنا بھی کسی طرح سے جائز نہیں ہے۔ تو کہاں یہ تعلیم اور کہاں وہ تعلیم کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ جنگ ہے اور جنگ کے سوا انسانی زندگی کا مقصد دنیا میں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر آپ غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی نظریہ مشکلات سے خالی نظر نہیں آتا۔ اگر اس تعلیم کو صحیح سمجھ لیا جائے کہ دنیا میں جنگ ہی جنگ ہے اور صلح کوئی چیز نہیں ہے اور فرض کیا جائے کہ ہر جماعت اور ہر فرد انہیں خیالات کو جگہ دے کر قدم آگے بڑھائے، تو یہ دنیائے

کائنات ختم ہوجائے گی اور اس کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔ اگر جنگ موافق فطرت ہے تو وہ ہر ہر نوع اور ہر ہر فرد کے لئے ضروری ہونا چاہئے۔ مگر جرمنی نے مثلاً ایک نسل کو اپنا مرکزِ اتحاد قرار دیا ہے اور اس ایک نسل کو متحد بنا کر دوسری نسلوں سے وہ مقابلہ کرنے کے لئے درپے ہے، تو اس نسل کے درمیان جسے وہ اپنی قوم قرار دیتے ہیں، ان کو بہرحال وہاں کے افراد کے درمیان صلح پسندی اور جذبۂ اتحاد پروری کی تربیت کرنا ضروری ہے اور اگر وہاں ایسا نہیں ہے تو وہ خود اپنے درمیان ایک دوسرے سے مصروفِ پیکار ہوجائیں گے اور اس کے بعد ان کا نظام داخلی خود اپنے ملک کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوگا۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کی اتنی ہمہ گیر تبلیغ اور تلقین اصول فطرت کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اور اگر تمام افراد انسانی کے دماغ میں ہٹلریت پیدا ہوجائے تو یہ تمام کائنات چند دن میں ختم ہوجائے گی۔ دوسری طرف یہ خیال کہ بس عدم تشدد اس کے سوا کچھ نہیں، یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اصول فطرت کے موافق ہوسکتا ہے۔ جب پولینڈ کے اوپر ہٹلر حملہ کردے تو کون سا غیر متشدد طریقہ پولینڈ اختیار کرے اور کونسا وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے وہ عدم تشدد میں کامیاب ہوسکے۔ عدمِ تشدد ہمیشہ اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب تک کہ فریق مقابل عدم تشدد سے متاثر ہونے کے قابل ہو۔ لیکن اگر کوئی فریق عدم تشدد سے متاثر ہونے کے قابل ہی نہیں رہا ہے تو ایسی صورت میں عدم تشدد تشدد کو دعوت دیتا ہے۔ ایک رخسارہ پر طمانچہ پڑنے کے بعد دوسرا رخسارہ پیش کرنے پر اگر مقابل اتنا شریف مزاج ہے کہ شرما کر ہاتھ ہٹالے۔ تب تو یہ اخلاق کے لئے تعلیم بہت ہی اچھی ہے۔ لیکن اگر ایک رخسارہ پر طمانچہ آتے دیکھ کر دوسرا رخسارہ بڑھانے سے وہ تلوار لے کر گردن قلم کردے اور پھر اسی مثال کو سامنے رکھ کر اس کی ہمّت اتنی بڑھے کہ وہ دوسرے بے گناہوں کو اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ قرار دے، تو اس ظلم اور تشدد کی جو اس ظالم کے ہاتھوں ہورہا ہے، ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اسی عدم تشدد پر جو پہلے شخص نے کیا تھا۔ یعنی یہ عدم تشدد دنیا میں تشدد کے اضافہ کا باعث ہے۔ اگر تشدد دنیا میں بری چیز ہے، تو ایسی صورتیں اختیار کرنا صحیح نہیں ہیں جن سے تشدد میں اضافہ ہو۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں جو قصاص کا حکم آیا ہے، تو اس میں ارشاد کیا گیا ہے۔ ''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيوةٌ'' (یعنی) تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ حالانکہ اس قصاص سے جان لی جاتی ہے۔ مگر نتیجہ اس کا جانوں کا بچانا ہے یعنی اگر قانون قصاص نہ جاری کیا جاتا تو دنیا میں واقعات قتل زیادہ پیش آتے۔ قانون قصاص کے جاری کرنے سے اگر ایک شخص کی جان گئی۔ شرعی قانون کے ذریعہ اور قاتل کو سزا دی گئی تو بہت سی زندگیوں کے تلف ہوجانے کا سدّ باب ہوگیا۔ اس بناء پر شخصی حیثیت سے اگرچہ جان جاتی ہے مگر اس کی وجہ سے اجتماعی حیثیت سے بہت سے لوگوں کو زندگی حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن اس قسم کا عدم تشدد جس کا نتیجہ تشدد کو بڑھانا ہے، حقیقتاً عدم تشدد نہیں ہے کیونکہ براہِ راست وہ عدم تشدد ہے مگر سرچشمہ ہے وہ تشدد کی ہمّت افزائی کا اور اس کے ذریعہ سے دنیا میں تشدد بڑھتا ہے۔ چور ایک گھر پر حملہ کرتا ہے اور مالک مکان دروازہ کھول دیتا ہے کہ تشریف لائیے، تمام اسباب حاضر ہے، لے جایئے۔ وہ تمام اسباب لے جاتا ہے اس کی ہمّتوں اور ارادوں میں اور تقویت ہوتی ہے اور وہ بہت سے گھروں پر اور ڈاکے ڈالتا ہے۔ اس صورت میں یہ جو مال لوٹا گیا ہے اور یہ ظلم وستم جو ہوا ہے اس کی ذمّہ داری عائد ہوگئی اس پہلے شخص پر کہ جس نے مال اٹھتے وقت چور سے مدافعت نہیں کی تھی اور اگر وہ دفاع کرتا تو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ غیر فطری چیز ہے اس لئے کبھی دائمی نہیں ہوسکتی مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگ ایک طرح سے فطری چیز بھی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جنگ کے خلاف ہونے کے کیا معنی اور فطری ہونا اس کا کس اعتبار سے ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ نظامِ انسانیت ہو بہو نظام کائنات کے ساتھ متحد

ہے، اور جو قوانین اور جو اصول نظام کائنات میں جاری ہیں، ان سے نظام عالمِ انسانی مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اوپر انسان کی رفعت اور بلندی کی وجہ سے حدود اور قیود عائد ہوجائیں۔ اس میں کچھ اور پابندیاں قرار دی جائیں، یہ دوسری چیز ہے۔ مگر نظامِ انسانی نظام کائنات کے بالکل برخلاف اور متضاد نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ چیز ہے کہ جس کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور اس کو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ یہ انسان خود ایک بہت بڑا عالم ہے۔ یعنی تمام دنیا عالمِ اصغر ہے اور انسان عالمِ اکبر ہے یعنی جو کچھ تمام دنیائے کائنات میں قانون نظر آتے ہیں، وہ اس انسان کے اندر، اس کی طبع میں مضمر ہیں۔ نظام طبعی کی دنیا میں جس وقت دیکھا جاتا ہے تو قدما اور متاخرین اگلے اور پچھلے سب نے اپنے اپنے الفاظ میں یہ دکھلایا ہے کہ نظامِ کائنات میں دو چیزیں موجود ہیں: ایک جذب اور ایک دفع۔ یعنی گوارائے طبع یا موافق طبع چیزوں کا اپنی طرف کھینچ کر اپنی طرف ملانا، اور ناگوار طبع یا خلاف طبع چیزوں کا اپنی طرف سے دور کرنے کی کوشش کرنا یا ہٹانا۔ دنیا کی ہر چیز میں کم وبیش یہ دونوں صفتیں پائی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے کے لوگوں نے اس کی مثالیں دے کر اس کی زیادہ تشریح کردی ہے۔ چیزوں میں آپ کو وزن محسوس ہوتا ہے یعنی کوئی چیز بھی اٹھائی جائے تو وہ سنگین معلوم ہوتی ہے۔ وزن اور سنگینی قوتِ جذب کا نتیجہ ہے۔ یعنی ہر چیز اپنے مرکز کی طرف سے ہٹانے میں وزنی معلوم ہوتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرکز کی طرف ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ جتنا چیز اپنے مرکز کی طرف زیادہ کھنچے گی، اتنا اس کا آپ کو وزن زیادہ محسوس ہوگا۔ جن چیزوں میں قوت جذب کم ہے، وہ ہلکی ہوں گی۔ اس میں مقدار کی کمی یا زیادتی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک بڑی چیز وزن میں سبک ہو اور ایک بہت مختصر اور چھوٹی سی چیز وزن میں زیادہ ہو۔ روئی کا ایک بہت بڑا گٹھا ایک طرف رکھئے اور تھوڑے سے لوہے کو ایک طرف رکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ روئی کا گٹھا دیکھنے میں اتنا بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ ہلکا ہے اور یہ لوہے کا ٹکڑا جو مقدار میں مختصر سا معلوم ہوتا ہے یا پتھر کا ٹکڑا جو مقدار میں کم نظر آتا ہے اس کا وزن زیادہ ہے تو بات کیا ہے؟ یہی کہ اس میں قوتِ جذب زیادہ ہے اور اس میں قوتِ جذب کم ہے۔ ایسی شائد کوئی شئے عالم میں نہیں ہے کہ جس میں قوتِ جذب بالکل ہی نہ ہو اور اگر بالکل نہ ہو تو اس کے اجتماع سے کوئی وزن ہی نہ پیدا ہوگا۔ یقیناً ہر شئے میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہی پایا جاتا ہے اور اس کو امیر المومنینؑ نے علم باری کی تفصیل میں ارشاد فرمایا ہے کہ "وَمِثْقَالَ كُلِّ ذَرَّةٍ" یعنی ہر ہر ذرّہ کائنات کا وزن جانتا ہے۔

بہرحال میرا مقصد یہ ہے کہ وزن نتیجہ ہے قوتِ جذب کا۔ یعنی وہ چیز درحقیقت اپنے مرکز سے ہٹنا نہیں چاہتی، گو آپ اس کو ہٹانا چاہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ جتنا اس میں اپنے مرکز کی طرف متحد رہنے کی قوت زیادہ ہے، اتنی ہی آپ کو اس کے مرکز سے جدا کرنے میں قوت زیادہ صرف کرنا پڑتی ہے۔ قوت دفع سے ایک شئے میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ روئی اگر ایک بڑی مقدار میں آپ کو معلوم ہوتی ہو اور اس کا قطر فرض کیجئے کہ ایک گز ہے۔ لیکن آپ اس کے اوپر ہاتھ رکھئے اور دبایئے تو اس کی وسعت بہ نسبت سابق کے بہت گھٹ جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں قوت دفع بہت کم ہے، مگر پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ اس میں قوت دفع بالکل نہ ہو، اس لئے کہ یہ روئی کبھی دبتے دبتے ایک وقت وہ آئے گا کہ وہ اب آپ کے دبانے کو قبول نہیں کرے گی یعنی اب آپ سے وہ جنگ کے لئے تیار ہوگی۔ گو قوت دفع اس میں بہت کم ہے مگر پھر بھی ہے ضرور۔ دنیا کی چیزوں میں سب سے کم قوت دفع ہوا میں ہے کہ ہر جسم کو وہ قبول کرلیتی ہے اور ہر جسم سے وہ ہٹ جاتی ہے لیکن ہوا میں بھی قوت دفع ہے ضرور۔ دیکھ لیجئے کہ فٹ بال جس وقت اس میں ہوا بھردی جاتی ہے تو پھر بڑی قوت صرف ہوتی ہے اس کے دبانے کے لئے۔ ہوا کی زیادہ مقدار جس وقت ایک محدود جگہ پر محبوس ہوجاتی ہے تو شاید وہ قوت دفع میں مقابلہ لوہے وغیرہ سے کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ

باوجودیکہ قوت دفع بہت کم مقدار میں ہوا میں ہے مگر پھر بھی قوت دفع اس میں موجود ضرور ہے۔ جس چیز کو بھی آپ لیں اور دبائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شئے ہم سے مقابلہ کر رہی ہے تو وہ چیز جو آپ سے برسرِ مقابلہ ہے، اسی کا نام ہے قوت دفع یعنی اپنے حدود میں کسی غیر کو آنے نہ دے۔ جتنی اس میں قوت دفاع زیادہ ہوگی، اتنی ہی آپ کو کاٹنے اور توڑنے میں قوت زیادہ صرف کرنا پڑے گی اور اس میں کسی شئے کے نافذ کرنے میں آپ کو دشواری زیادہ پیدا ہوگی۔ اس قوت دفع اور جذب سے آج کل دنیا کے تمام حکماء کہتے ہیں کہ تمام کائنات کا وجود ہوا ہے۔ مگر الوہیت کے اقرار کے بعد بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم مادیت کے جو اصول فلسفی اور قواعد ہیں، ان کا بالکل ہی انکار کر دیں۔ مگر سوال تو صرف کافی اور ناکافی کا ہے۔ یعنی وہ اس کو کافی سمجھتے ہیں اور ہم اس کو ناکافی سمجھتے ہیں۔ عالمِ کائنات کے وجود میں نہ یہ ہے کہ مادیین اگر مادّہ کے خواص کو بیان کرتے ہیں تو موحدین کا فرض یہ ہے کہ وہ ان خواص کا انکار کریں، کیونکہ وہ خواص صرف طبعی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح ادویہ میں خواص مضمر ہیں، اسی طرح سے اور چیزوں میں بھی کم وبیش موجود ہیں۔ ایک شخص جس کا ایمان کھوٹا ہے، وہ اگر منحرف ہو جائے اور خداوند عالم کے وجود سے انکار کر دے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام اس کی مخلوق ان خواص کے وجود سے منکر ہو جائے۔ اسی طرح سے کائنات کے مختلف اجزاء اور مختلف عناصر میں جو خواص اور خصوصیات ہیں ان کو مانا جائے، تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے خدا کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ اس بناء پر عالمِ کائنات کے متعلق جو خواص دریافت کئے گئے ہیں تجربات سے، مشاہدات سے، عقلی حیثیت سے یا مذہبی حیثیت سے یا کسی جہت سے بھی، وہ قابل انکار نہیں ہیں۔ قوتِ جذب کا نتیجہ ہے اپنی مناسبت سے مرکز کے ساتھ ملنا، قوت دفع کا نتیجہ ہے اپنے سے ناگوار چیز کا ہٹانا۔ اگر آپ غور کیجئے تو یہ جذب اور دفع، اس کی دوسری تعبیر ہے صلح یا جنگ۔ اس بناء پر کسی کا صلح کو لے کر جنگ سے منحرف ہو جانا یا کسی کا جنگ کو لے کر صلح سے بالکل روگرداں ہو جانا، یہ عالمِ طبیعیات کے اصول کے بالکل ہی خلاف ہے۔ جب کہ کائنات میں دونوں ہی قوتیں مضمر ہیں اور دونوں قوتیں اپنا اپنا اثر دکھلاتی ہیں تو کسی ایک قوت کے ساتھ ہو کر رہنا بالکل غیر ممکن ہے۔ کائنات میں جو یہ اسباب مضمر ہیں، عالمِ انسانیت میں بھی بعینہٖ یہی کارفرما ہیں۔ انسان کا یہ گوشت و پوست اور اس کا یہ جسم تو بہرحال اسی عالم طبیعات کا جزو ہے۔ اس لئے جو قانون تمام دنیا کی چیزوں میں مضمر ہے وہی اس انسان کے جسم میں کارفرما ہے۔ جسمانی حیثیت سے اس کا جذب اور دفع وہی ہے کہ جو تمام اجسام کا ہے۔ یعنی اس انسان کا جذب وہی وزن ہے کہ جو اس انسان میں پایا جاتا ہے یعنی اسے اگر آپ ترازو میں تولئے تو آپ کو وہ بوجھل معلوم ہوگا اور اٹھانے میں بھاری محسوس ہوگا۔ اس میں بھی مختلف درجہ ہیں، کوئی زیادہ ہے کوئی کم ہے۔ جس طرح سے دوسری چیزوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی میں قوتِ جذب کم ہے، کسی میں زیادہ ہے، اسی طرح سے انسان میں بھی باعتبار کیفیت بہت ممکن ہے کہ مقدار میں ایک انسان دوسرے سے بالکل مساوی ہو یعنی قطر میں مثلاً یہ شخص جتنا لمبا ہے، اتنا ہی لمبا وہ ہے، جتنا چوڑا یہ ہے، اتنا ہی چوڑا وہ بھی ہے، لیکن پھر بھی ایک کا وزن زیادہ ہے اور ایک کا کم ہے۔ یہ اسی قوتِ جذب کا نتیجہ ہے بغیر کسی مشابہت اور بغیر کسی تاویل کے۔ اور جس طرح سے تمام دنیا کی چیزوں میں قوت دفع موجود ہے، اسی طرح سے اس انسان کے جسم میں موجود ہے، مگر انسان کا جسم مختلف اجزاء رکھتا ہے اپنے اندر۔ اس لئے ہر ایک کی قوت دفع مختلف ہے یعنی گوشت میں قوت دفع بہ نسبت ہڈی کے کم ہے۔ ہڈیوں میں بھی آپس میں اختلاف ہے۔ کوئی ہڈی نرم ہے اور کوئی سخت ہے یہ اس اعتبار سے تھا کہ انسان کا جسم تمام دنیا کی چیزوں کے ساتھ منسلک اجسام میں منسلک ہے، لیکن یہ انسان بہ اعتبار اپنے اس جوہر کے کہ جو اس کو انسان بنانے والا ہے جس کا نام ہے نفس ناطقہ۔ اس انسان کی قوت جذب مختلف ہو جاتی ہے ان تمام اجسام سے کہ جن میں یہ خاص قوت مضمر نہیں

ہے، مگر ان میں قوت جذب اور قوت دفع کم و بیش موجود ضرور ہوگی۔ لیکن جس طرح سے یہ چیز خود جسم نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ جذب اور دفع بھی جسمانی نہیں ہوگا یعنی اجسام میں قوت جذب کا نتیجہ تھا بوجھل ہو جانا، اس میں بوجھل ہونا نہیں ہے کیونکہ یہ صفت خود جسم سے مخصوص ہے۔ لیکن بوجھل ہونے کا جو نتیجہ ہے وہ ظاہر ہو جائے گا۔ قوت دفع کا نتیجہ ہے سخت ہو جانا۔ مگر یہاں یہ سختی ظاہر ہوگی نفس کے ذریعہ سے۔ آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے اگر میں دوسرے الفاظ میں یہ کہوں کہ جو نبض شناس اور فطرت شناس انسان تھے انھوں نے یہ کہا ہے: **"الارواح جنود بجندة فما تعارف منها أتلف و ما تناکر منها اختلف"** روحوں کو صف باندھے ہوئے تیار شدہ لشکر سمجھئے، وہ روحیں جو آپس میں شناسائی رکھتی تھیں بہ اعتبار اوصاف کے۔ یعنی جو مناسبت رکھتی تھیں روحیں دوسری روحوں کے ساتھ۔ ایک نفس دوسرے نفس کے ساتھ تو ان میں آپس میں الفت پیدا ہوئی اور جو بہ اعتبار اوصاف ایک دوسرے سے آپس میں مختلف ہوئیں تو ان میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ یہ ہے حقیقۃً اس جذب اور دفع کا فلسفہ جو عالم انسانی میں روحانی صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔ بالکل اسی حیثیت سے کہ جیسے ایک چیز کو زمین سے اٹھایا تو اس کے اٹھانے میں وزن معلوم ہوگا، اسی طرح سے اگر ایک انسان کو اس کے وطن سے دور کرنا چاہیئے تو اس میں دشواری ہوگی اور دقت محسوس ہوگی۔ خود اس کے نفس کو یہ ہٹانے میں دشواری پیدا ہونا بالکل ہی ویسا ہے جیسا کہ جسم کو زمین سے اٹھانے میں وزن معلوم ہوتا ہے۔ اس وزن کے محسوس ہونے کے معنی یہ تھے کہ وہ اپنی جگہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے، اسی طرح سے اس کے اپنے وطن سے علیحدہ ہونے میں دشواری محسوس کرنا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے یہاں سے جدا ہونے کو گوارا نہیں کرتا۔ اس کو آپ دوسرے الفاظ میں محبت سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ مختلف افراد میں مختلف جماعتوں میں آپ محبت یا اتحاد کے الفاظ سے جس چیز کو تعبیر

کرتے ہیں وہ وہی کشش ہے ایک کی دوسرے کی طرف۔ اس کا ایک قوی درجہ وہ ہوتا ہے جس کا آپ نے عشق نام رکھا ہے۔ اسی کشش کا عملی نتیجہ ہے اتفاق و اتحاد اور صلح۔ اس کے برخلاف اگر ایک انسان کو آپ جنگل میں لے جانا چاہیں اور وہاں رکھنا چاہیں تو وہاں جا کر اس کا دم الٹے گا اور گھبرائے گا، وہ کسی طرح سے وہاں رہنے پر راضی نہ ہوگا۔ آپ اس کو وہاں رکھنے پر مجبور کریں تو وہ انکار کرے گا۔ آپ ہاتھ پکڑ کر رکھنا چاہیں تو وہ ہاتھ چھڑائے گا۔ یہ نتیجہ ہے قوتِ دفع کا یعنی دور کرنے کی قوت ناگوار طبع چیز کو، جسے انسان اپنے لئے پسند نہیں کرتا اور جو اس کی طبیعت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ افراد انسانی میں مختلف جماعتوں میں، مختلف اشخاص میں بہ اعتبار اوصاف بہ اعتبار خیالات جو تناسب یا عدم تناسب ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے جذب اور دفع کے نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ ایک انسان دوسرے کو زیادہ چاہتا ہے، اس بنا پر کہ اس کی سیرت کو پسند کرتا ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو چاہتا ہے اس بناء پر کہ وہ اس کے مساعی کو بہت پسند کرتا ہے اور جس مقصد کے لئے یہ کوشش کر رہا ہے، اسی مقصد کے لئے وہ کوشاں ہے۔ اس اتحاد مقصد کے لئے اس کے ساتھ دل بستگی محسوس کرتا ہے اور اس کے ساتھ ایک ارتباط قلبی محسوس ہوتا ہے۔ یہ مختلف چیزیں انسان میں فطری طور پر کچھ نہ کچھ ضرور پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم وطنی، ہم مذہبی، ہم خیالی۔ یہ "ہم" جہاں پر آ جائے ہمیشہ اس کے (معنی) یہ ہیں کہ دو آدمیوں کو ایک نقطہ پر لے جا کر مشترک کر دینا۔ آپ کہیں پردیس میں جائیے اور وہاں آپ کو کوئی وطن کا آدمی مل جائے فوراً اس کو دیکھ کر دل تڑپ جاتا ہے، حالانکہ آپ جس وقت تک وطن میں رہے اس وقت تک آپ اس سے ملنے میں گریز کرتے رہتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس آدمی سے گفتگو کریں، مگر وہاں جب وہی شخص آپ کے سامنے آتا ہے تو آپ خود اس سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں کہ اس آدمی سے جو ہمارا ہم وطن ہے کسی صورت سے ملاقات ہو جائے۔ یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ اسی ہم وطنی کا نتیجہ ہے۔ حقیقتاً

یہ اس کی طرف آپ کا ارتباط نہیں ہے بلکہ جس سے اس کا ارتباط ہے، اسی سے آپ کا بھی ارتباط ہے۔ یعنی وطن بیچ میں ہے اور یہ محبت اصل میں وطن کی ہے۔ جو آپ کو اہل وطن کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتی ہے اور یہ قانون ارتباط ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ قانون محبت ہے کہ جو کسی شخص کی طرف قلبی حیثیت سے میلان رکھتا ہے، تو وہ جس چیز سے رشتہ رکھتا ہے اس کی طرف بھی قلبی تعلق محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ قوت جذب ہے کہ جو انسان محسوس کرتا ہے، اس وحدت کے رشتہ کی وجہ سے جو دو چیزوں کو پرو دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے اسباب بہت سے ہوتے ہیں۔ دو بھائی اس لئے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کہ دونوں کا رشتہ باپ میں متحد ہو جاتا ہے اور وہ باپ محل ارتباط ہوتا ہے۔ جتنا یہ ارتباط زیادہ قریب ہوگا، اتنا ہی کشش کا اثر زیادہ نمودار ہوگا اور جتنا یہ دور ہوگا، اتنی ہی کمی ارتباط میں محسوس ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اس قوت کا جو اقتضا ہے، اس کے خلاف کوئی خلاف اوصاف یا خلاف مزاج یا خلاف مقصد پہلو ہو جس سے دفاع کا بھی اقتضا پیدا ہو جائے، تو یہ قوت دفع اور قوت جذب دونوں ٹکرا کر ایک درمیانی راستہ پیدا کر دیتی ہیں۔ کبھی قوت دفع قوت جذب کو مغلوب بنا کر اس حقیقی بھائی باپ یا بیٹے کو دشمن قرار دیتی ہے۔ تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قوت جذب وہاں پر موجود ہی نہیں تھی۔ بلکہ قوت دفع تھی جس نے اس کے اثر کو باطل کر دیا۔ معلوم ہوا کہ دنیا میں قوت جذب اور قوتِ دفع یہ ایک دوسرے کی طرف میلان اور ایک دوسرے سے متنفّر کی باعث ہوتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کو کہا جاتا ہے دشمنی اور دوسری وہی چیز ہے کہ جس کو کہا جاتا ہے دوستی اتحّاد اور یگانگت۔ اب اگر آپ دنیا کو ان خصوصیات میں سے کسی ایک کا پابند بنا سکیں، یعنی آپ دنیا میں قوتِ جذب ہی کو کارفرما بنا دیجئے، قوت دفع کو باطل کر دیجئے یا قوت دفع کو باقی رکھئے قوت جذب کو دنیا سے نیست و نابود کر دیجئے۔ تب آپ کا کسی ایک طرف فیصلہ کی طرف جانا صلح اور جنگ کے معاملہ میں یعنی بلا استثناء صلح کا علم بلند کر دینا۔ یا بلا استثناء جنگ کا علم بلند کرنا درست ہوگا لیکن جب تک دنیا میں یہ دونوں نظام کارفرما ہیں اور دنیا میں جذب و دفع کے خصوصیات موجود ہیں، اس وقت تک صلح کو آپ کا بلا استثناء کہنا یہ بھی فطرت سے جنگ ہے اور جنگ کو بلا استثناء کہنا یہ بھی فطرت سے جنگ ہے یا یہ کہ عدم تشدد بلا استثناء بغیر کسی قید کے ہر موقع پر اور ہر محل پر یہ بھی اصول فطرت کے خلاف ہے اور یہ بھی باعثِ جنگ ہے اور تشدد کے علاوہ کچھ اور نہ ہو یہ بھی اصول فطرت کے بالکل خلاف ہے لیکن اب آپ یہ ملاحظہ فرمائیے کہ قوت دفع جو جنگ کی باعث ہے، یہ کب کارفرما ہوتی ہے؟ جب کوئی ناگوار طبع یعنی خلاف فطرت چیز انسان کے مقابلہ میں آئے تب قوتِ دفع برسر کار آتی ہے۔ یعنی اگر دنیا میں تمام باتیں سازگار رہتی رہیں تو قوت دفع کے عمل کا موقع ہی نہیں آئے گا اور ہر چیز سکوت کے ساتھ اپنی منزلِ حیات پر گامزن رہے گی۔ دنیا میں تصادم یا کشمکش یا قوتِ دفع کا عمل، یہ تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں خلافِ طبع صورتیں پیدا ہونے کی وجہ سے، اس لئے کہ قوت دفع ہمیشہ مقابلہ چاہتی ہے اس سے کہ جو مخالف ہے۔ تو اگر فطرت کے مطابق ہر بات ہوتی رہے تو کبھی قوت دفع کے ظاہر ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ قوت تو موجود ہے جنگ کی ہر طبیعت میں مگر اس کا عمل اس وقت میں ہوتا ہے کہ جب خلاف فطرت حالات پیدا ہوں اور چونکہ فطرت اپنے خلاف طبع کو ہمیشہ برداشت نہیں کر سکتی اور یہ غیر ممکن ہے یا وہ خود فنا ہو جائے گی یا اپنے مخالف طاقت کو ہٹا دے گی۔ اس بنا پر میں یہ کہتا ہوں کہ جنگ کبھی دائمی نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں صلح ثابت چیز ہے اور جنگ عارضی۔ دنیا میں سکون ایک طبعی چیز ہے اور جنگ غیر طبعی۔ جہاں دو جماعتوں میں جنگ ہو تو یقیناً سمجھئے کہ صلح بعد میں ضروری ہے اور خلافِ جنگ جو صورتیں پیدا ہوں اس کو سمجھئے کہ یہ موافق فطرت ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بنائے مخاصمت کسی سے قائم رہے لیکن جنگ کا دائمی طور سے برقرار رہنا ہمیشہ ناممکن سی چیز ہوگا۔ اس کا دوام وثبات ہو ہی نہیں سکتا۔ جب

کوئی سبب پیدا ہوگا اس کے ابھارنے کا تب وہ ابھرے گی، بغیر اس کے یہ صورت ناممکن ہے اور جنگ کا پیدا ہونا بنائے مخاصمت کا محتاج ہے اور جنگ کا ظہور ہمیشہ ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تو اب ہم بیشک صلح اور جنگ میں بلا استثناء نہ صلح کی دعوت دے سکتے ہیں، نہ بلا استثناء جنگ کی دعوت دے سکتے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا کہ عقلی حیثیت سے وہ بھی فطرت کے خلاف ہے اور یہ بھی فطرت کے خلاف ہے۔ مگر مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ صلح پہلے ہے اور اس کے بعد جنگ۔ یعنی درجہ کے اعتبار سے ترتیب کے اعتبار سے ایک شئے اپنے اقتضائے طبیعت پر چھوڑ دی جائے تو صلح ہی صلح ہے لیکن تقاضائے طبیعت کے خلاف ناگوار حالات کے پیدا ہونے پر جنگ ہوتی ہے تو یہ کہنا ہے ہٹلر کا۔ جو فقرات میں نے پہلے پیش کئے تھے کہ دنیا میں پہلے جنگ ہے اور پھر امکانِ صلح۔ یہ بات بالکل فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ میں کہوں گا کہ نہیں پہلے امکانِ صلح ہے اور جب امکانِ صلح نہ رہے تب جنگ ہے۔ یعنی دو شخصوں میں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہیں یا ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں پہلے اس کا امکان پیدا کرتا ہے کہ ان دونوں میں ہمیشہ آپس میں اچھے تعلقات قائم رہیں اور نبھ جائے کیونکہ یہ طبیعت کے موافق بات ہے۔ جب نہ نبھے، اور دونوں کے تعلقات ناسازگار ہو جائیں تب تدریجی حیثیت سے جنگ کی نوبت پہنچتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں پہلے امکانِ صلح ہے اور پھر جنگ، اور پھر فطرتاً ایک وقت میں اختتام جنگ لازمی ہے، خواہ اختتام جنگ صلح کی صورت میں ہو، خواہ اختتام جنگ کسی ایک طاقت کے ختم ہوجانے کی صورت میں ہو۔ لیکن جنگ کا نہ دائمی ہوسکنا اس بات کا ضامن ہے کہ صلح کا درجہ جنگ کے قبل ہے اور جنگ کے بعد بھی ایک ایسی صورت کی ضرورت ہے، چاہے صلح ہو یا ایک فریق بالکل فنا ہوجائے۔ معلوم ہوا کہ فطرت کا تقاضا، جس کی عام حالات میں دعوت دینا چاہیئے، وہ ہمیشہ امن و سکون اور اطمینان وسلامتی ہے۔ اس کے برخلاف صورتیں ہمیشہ غیر معمولی حالات کی بنا پر پیدا ہونا چاہئیں جبکہ صلح کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اور اگر صلح کی کوئی بھی صورت پیدا ہوسکتی ہے تو پھر جنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اب تک کوئی آیت، کوئی مذہبی تعلیم، کوئی حدیث آپ کے سامنے نہیں پیش کی بلکہ عقلی حقایق ہیں کہ جو میں نے آپ کو دکھلائے ہیں اور آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اب دنیا کے تمام مذاہب میں آپ تلاش کر لیجئے کہ کون مذہب وہ ہے کہ جو اپنے تعلیمات میں اسی اصول کی تلقین کرتا ہے جو مذہب اس اصول کی تلقین کرتا ہے اُس کو آپ موافق فطرت تسلیم کریں اور جو مذہب اس اصول کے خلاف دعوت دیتا ہو اس کو آپ خلاف فطرت قرار دیں۔ بہر حال میں نے آپ کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ مقتضائے فطرت وطبع فطرت اتحاد و صلح ہے اور ناگوار فطرت وہ حالات پیدا ہونا کہ جن کے باعث جنگ کرنا پڑے۔ اس کو میں ٹھیٹھ اردو میں کہوں گا کہ صلح تو کی جاتی ہے بخوشی (فطرت کی تحریک سے) مگر جنگ کرنا پڑتی ہے۔ اتفاق اور اتحاد تو فطرت کے تقاضے سے بخوشی کیا جاتا ہے اور لڑائی کا جب وقت آتا ہے تو لڑائی لڑنا پڑتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہر وہ چیز جو مجبوری اختیار کی جائے وہ حدود و شروط کے ساتھ مقید ہوتی ہے۔ اس لئے ایک انسان اس وقت قابل الزام سمجھا جائے گا جب کہ وہ باوجود امکان صلح کے جنگ کا اقدام کرے۔ ہاں اگر صلح کی کوشش کر لی جائے اور ناکامی ہو تو پھر وہ صورت سامنے آئے گی کہ جو عقلی حیثیت سے جنگ کی نوبت تک پہنچ جائے۔ بہر حال یہ کوشش ہمیشہ کرتے رہنا چاہیئے کہ دنیا میں امن قائم رہے، لیکن ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک قانون ایسا بنایا جائے کہ کوئی شخص لڑے نہیں، کیونکہ لڑنا تو فطرت کی مجبوری سے بعض حالات میں ہوتا ہے۔ اگر وہ حالات نمودار ہوں تو لڑنا اسی صورت سے فطری ہوتا ہے جس صورت سے بغیر ان حالات کے پیدا ہوئے صلح، اتحاد اور اتفاق قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر یہ صورت تو ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی جو حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ الفاظ خوشگوار ضرور ہیں۔ نظریات بہت بلند

ہیں۔ خیالات بہت اچھے ہیں مگر وہ خیالات کبھی دنیائے عمل میں کامیاب ہوسکیں، یہ غیر ممکن ہے، خواہ رہنمایان مذہب کے یہ خشک الفاظ ہوں جو کاغذ پر آگئے ہیں اور خواہ دنیا کے سلاطین کے باہمی معاہدے ہوں، خواہ بڑی سے بڑی کانفرنس ہو، خواہ اقوامِ عالم کا اجتماع ہو اگر وہ براہ راست جنگ اور اس کے متعلقات کے اوپر پابندیاں عائد کرے تو وہ پابندیاں کامیابی کی منزل سے روشناس نہیں ہوسکتیں اس بناء پر کہ ان اسباب کا سدِّ باب نہیں ہوتا کہ جو اسباب قہری حیثیت سے جنگ کے دروازے کو کھولتے ہیں۔ کامیاب تعلیم و کامیاب قانون محض وہی ہے کہ جو ان اسباب فطری کے نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنگ کے موقع پر جنگ کی اجازت دے، مگر حتی الامکان ان اسباب کا قلع قمع کرے جو دنیا میں منافرت پیدا کرتے ہیں اور ان اسباب کو مٹائے کہ جن اسباب کی بناء پر قوت دفع کارفرما ہوتی ہے، یعنی دنیا کے طبائع میں یک جہتی۔ وحدت، ہم آہنگی کا احساس پیدا کرے تاکہ وہ اجنبیت اور مغائرت، جو دنیا میں ایک کو دوسرے سے متنفر بنا کر ایک وقت میں برسر پیکار بناتی ہے، دور ہو۔ اگر کوئی قانون اتحاد کے جذبات کو بیدار کررہا ہے اور اس قسم کے جذبات کو جو جنگ کا باعث ہوتے ہیں دبانے کی کوشش کررہا ہو تو وہ قانون وہی ہوگا جو انسان کی رفعت اور بلندی کا سبب ہوگا، گو لفظی حیثیت سے اس نے مدافعانہ جنگ کی اجازت دی ہو اور اگر قانون ایسا ہے کہ وہ الفاظ سے یہ دعوت دیتا ہے کہ تم خبردار جنگ نہ کرنا لیکن بجائے وحدت پیدا کرنے کے وہ مغائرات کا احساس زیادہ پیدا کرتا ہے اور بجائے یک جہتی کے جذبات پیدا کرنے کے وہ جدائی کے جذبات پیدا کرتا ہے تو ایسا قانون گولاکھ چلائے کہ تم جنگ نہ کرنا مگر حقیقتاً یہ باعث ہوگا دنیا میں فتنہ و فساد پیدا کرنے کا۔

یہ معلوم ہوچکا کہ انسان میں یہ تقاضائے فطرت دونوں جذبات موجود ہیں۔ اسی صورت سے جس طرح کائنات عالم میں دو قوتیں ہیں جذب اور دفع ویسے ہی اس میں ایک گوارائے طبع چیز کو حاصل کرنے یا اس کے ساتھ متحد رہنے کی طاقت ہے اور دوسری ناگوار طبع چیز کو دور کرنے کی قوت۔ مگر انسان تو اس دنیا میں ایک امتحانی منزل میں قرار دیا گیا ہے یعنی دنیا کی ہر چیز کائنات کی ہر شئے تقاضائے فطرت کے پورا کرنے میں آزاد ہے۔ مگر انسان اگرچہ وہ سب سے بلند ہے مگر وہ اپنے تقاضائے فطرت کے پورا کرنے میں مقید ہے۔ کھانا بتقاضائے فطرت کھاتا ہے۔ مگر ہر چیز، ہر موقع پر، جو سامنے آئے، بامحل یا بے محل، وہ نہیں کھا سکتا۔ سونا بہ تقاضائے فطرت ہوتا ہے لیکن ہر وقت ہر جگہ ہر موقع پر ممکن نہیں ہے۔ بہ تقاضائے فطرت ہنستا ہے، بہ تقاضائے فطرت روتا ہے، بات کرتا ہے۔ غرض کہ دنیا کے بہت سے کام ہیں وہ سب اس کے بہ تقاضائے فطرت سرزد ہوتے ہیں مگر ان میں سے کسی چیز میں بھی وہ آزاد نہیں ہیں۔ اس کو بہ تقاضائے فطرت بعض کاموں کو بعض مواقع پر پورا کرنے کا حق حاصل ہے مگر بعض مواقع کے اوپر اس کو بعض کاموں کے پورا کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اور ان ہی حدود کے لحاظ سے اس کی انسانیت وابستہ ہے اور اس انسانیت کے مدارج کی ترقی جو کچھ ہے، وہ صرف انسانی حدود اور قیود کے ذریعہ سے وابستہ ہے۔ اس لئے یہ بتانے کے بعد بھی کہ قوتِ جذب اور قوتِ دفع اس انسان میں موجود ہے، پھر بھی ہر انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ ہر موقع پر اپنی ان قوتوں سے کام بھی لے۔ بلکہ ان قوتوں سے کام لینے کے لئے اس کے اوپر قیود اور حدود کی پابندی لازم ہوتی ہے، اور اس اعتبار سے اس کو موردِ ملامت یا موردِ تعریف قرار دیا جاتا ہے۔ کام ایک ہے جو دونوں انسان کرتے ہیں اور دونوں فطرت کے تقاضے سے کرتے ہیں مگر ایک اپنی فطرت کو بامحل انجام دیتا ہے، وہ قابل تعریف ہے اور دوسرا اسی تقاضائے فطرت کو بلا لحاظ شرائط اور قیود کے انجام دیتا ہے، وہ قابل ملامت قرار پاتا ہے۔ اب یہ دیکھنے کی ضرورت پیدا ہوجاتی ہے کہ کس موقع پر انسان اگر اپنے اس فطری حق کو استعمال کرے تو وہ اس کا حق ہوگا اور کن صورتوں میں وہ اسے

انجام دے تو وہ اس کا حق نہ ہوگا۔ اگر چہ صلح اور جنگ دونوں ہی بہ تقاضائے فطرت ہیں لیکن عام طور پر صلح کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ’کیوں؟‘ اور جنگ کے لئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ’کیوں؟‘ کس لئے؟ اور کس موقع پر؟ یہ حقیقتاً ایک لازمی نتیجہ ہے اس تفریق کا جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اگر چہ صلح اور جنگ دونوں انسانی قوتوں کے کارفرما ہونے کا نتیجہ ہیں، مگر ان قوتوں کے عمل میں ایک کا درجہ مقدم ہے اور ایک کا درجہ مؤخر ہے۔ امن اور سلامتی، صلح و آشتی، یہ انسان کے مطابق فطرت حالات کا نتیجہ ہے اور جنگ ایک انسان کے لئے خلاف فطرت یا ناگوارطبع حالات کے پیدا ہونے کی صورت میں عائد ہوتی ہے۔ تو اگر کوئی شخص جنگ کے لئے تیار ہو، اس وقت یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا واقعی ایسے غیر طبعی حالات تھے کہ جہاں اس کو جنگ کرنا پڑے یا اس طرح کے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے؟ اگر اس طرح کے حالات پیدا ہوئے ہیں کہ جہاں اس کو جنگ کرنا چاہیئے تو وہ جنگ اس حیثیت سے صحیح قرار دے دی جائے گی اور اگر اس طرح کے حالات کا نتیجہ نہ ہوا تو وہ جنگ خلاف فطرت قرار دی جائے گی۔ اور اس طرح سے ایک انسان ایسے حالات میں کہ جہاں واقعی مقتضائے جنگ نہیں ہے اور وہ جنگ کا اقدام کرتا ہے، موردِ ملامت قرار پاتا ہے، اس بناء پر کہ اس نے فطرت کی عطا کردہ قوت سے غلط فائدہ اٹھایا یعنی انسان جب کسی کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کے اوپر دنیا کی نظریں اٹھ جاتی ہیں۔ اب تک اس نے جنگ نہیں کی تھی تو کوئی بھی پوچھنے والا نہ تھا کہ کیوں جنگ نہیں کی؟ لیکن جس وقت کہ جنگ کے لئے ہاتھ اٹھتا ہے، تو دنیا اس سے دریافت کرنے پر تیار ہے کہ یہ جنگ کس لئے ہے؟ اس کے معنی یہی ہیں کہ خود دنیا اس کو تسلیم کئے ہوئے ہے کہ عدم جنگ عام حالات کا نتیجہ ہے اور جنگ غیر معمولی حالات کا نتیجہ ہے جس کے لئے سوال کی ضرورت ہے۔ لڑنے والا بیچارہ، اس کو لڑائی سے فرصت نہیں ہے اور اس طرف یہ سوالات ہیں کہ آپ مقصد جنگ واضح کیجئے اور لطف یہ ہے کہ ہر ایک کو کچھ مقاصد جنگ بیان بھی کرنا پڑتے ہیں یعنی جنگ کبھی خود مقصد نہیں قرار پاسکتی اور ہمیشہ ایک دوسرے مقصد کے لئے وہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے اگر جنگ کی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور تراشے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کے بیان کردہ اسباب واقعیت کے مطابق ہوں اور کسی کے بیان کردہ اسباب صرف حیلے تراشے ہوئے ہوں، مگر بہر حال ہر ایک اپنی جنگ کا مقصد کوئی نہ کوئی قرار ضرور دے گا جس کی وجہ سے وہ حق بجانب قرار پاسکے۔ ہٹلر کا بھی اعلان ہے کہ ہم دنیا میں ظلم و استبداد کو دور کرنے کے لئے جنگ کرتے ہیں اور جب تک ظلم دنیا سے دور نہیں ہوجائے گا اس وقت تک ہم تلوار کو نہیں روکیں گے اور مقابل جماعتیں بھی یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم دنیا کی جمہوریت اور حق آزادی کی حفاظت کے لئے جنگ کرتے ہیں اور جس وقت تک دنیا میں یہ استبداد کا دیو مغلوب نہ ہولے گا اور اس کا اثر بالکل نہ زائل ہوجائے گا، اس وقت تک ہم جنگ سے ہاتھ نہیں روکیں گے۔ تو اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ صلح و آشتی کے لئے کسی سبب کسی مقصد کے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی وہ خود مقصد ہے۔ مگر جنگ کے لئے یہ ضروری ہے کہ جنگ کے لئے کسی ایسے مقصد کا اظہار ہو کہ وہ جنگ کو صحیح بنائے۔ اب وہ کون سے مواقع ہوسکتے ہیں کہ جہاں انسان کے لئے جنگ کرنا صحیح ہے اور کون سے وہ مواقع ہیں کہ جہاں انسان کے لئے جنگ کرنا صحیح نہیں ہے؟ اس موقع پر کہ جب خود اس انسان کی حفاظت جنگ کے اوپر موقوف ہے، یعنی اپنی زندگی کا تحفظ یا اپنے سے متعلق چیزوں کا تحفظ اس کو یوں کہا جائے کہ ایک دوسرا شخص خلاف فطرت جنگ کرے اور یہ شخص فریق مخالف کے اقدام کی وجہ سے مجبور ہو جنگ پر، تو یہ وہ جنگ ہے کہ جس کو جنگ دفاعی کہا جاتا ہے۔ ایک فریق نے ہم پر حملہ کیا، ہم اپنی حفاظت کے لئے، اپنے بچاؤ کے لئے اس سے جنگ کرتے ہیں۔ اس میں بھی دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف صرف سلب ہی سلب ہے اور ایک میں اپنی طرف سے اثبات بھی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ

بس ہم اپنا بچاؤ کریں اس کے آگے ہم کوئی اقدام نہ کریں اور دوسری بات یہ ہے کہ نہیں ہم کوئی جوابی جنگ بھی کریں، اپنی حفاظت کے ساتھ اس بنا پر کہ اس نے ہم سے جنگ کی تھی اور اب ہم خود بھی جنگ کریں۔ دوسری لفظوں میں ایک تو یہ صورت ہے کہ ہم اس کے وار کو رد کریں اور اپنی حفاظت کریں بس۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہم پر حملہ کیا گیا اور ہم نے حملہ کو خالی دیا ردکیا، اور اس کو شکست دی اور اس کے بعد پھر ہم نے بھی حملہ کیا اور اس کی سند یہ قرار دی کہ چونکہ اس نے ہم پر حملہ کیا تھا اس بنا پر ہم نے بھی اس کے اوپر حملہ کیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں الگ الگ ہیں پہلے میں صرف حفاظت ہے۔ اور دوسرے میں حفاظت کے ساتھ ایک تبادلہ کا بھی عنوان ہے، ایک معاوضہ کی بھی صورت ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ ہمارے خلاف اقدام جنگ نہ کرے لیکن ہم خود آگے بڑھ کر اس کے خلاف محاذِ جنگ قائم کریں۔ یہ وہ چیز ہے کہ جس کو جارحانہ اقدام کہا جاتا ہے۔ جو پہلی دونوں قسمیں ہیں، ان میں باہم تفرقہ ہے لیکن پھر بھی وہ پہلی دونوں صورتیں جارحانہ جنگ نہیں سمجھی جاتی ہیں بلکہ دونوں کو مدافعانہ جنگ کہا جاتا ہے لیکن تیسری صورت جارحانہ جنگ کی ہے۔ اس نے ہمارے خلاف حملہ نہیں کیا، لیکن ہم اس کے اوپر حملہ کریں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عقلی حیثیت سے ان میں سے کون سا موقع وہ ہے کہ جہاں جنگ کرنا صحیح اور درست ہوگا اور کون سا موقع وہ ہوگا کہ جہاں جنگ کرنا درست نہ ہوگا۔

اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ جو جنگ کی جائے اس جنگ کے حدود کیا ہیں اس لئے کہ جنگ جن لوگوں سے کی جاتی ہے، ان میں کچھ قابل جنگ ہوتے ہیں اور کچھ قابل جنگ نہیں ہوتے ہیں۔ مثلاً مرد، عورتیں، بچے۔ مردوں میں جوان، بوڑھے، سن رسیدہ عموماً اس کے علاوہ شہری اور جنگلی لوگ۔ ایک جماعت وہ ہوتی ہے کہ جو جنگ کے لئے تیار کی جاتی ہے اور وہ میدانِ جنگ میں آتی ہے۔ ایک جماعت وہ ہوتی ہے کہ جو شہر میں اپنے کاروبار زندگی میں مصروف ہوتی ہے۔ کچھ لوگ تجارت کررہے ہیں، کچھ لوگ اپنے گھروں میں ہیں ممکن ہے کہ اگر وہ فوجی تربیت حاصل کریں تو وہ بھی قابل جنگ ہوں مگر وہ عملی طور پر جنگ سے بالکل علٰیحدہ ہیں۔ تو جب دو فریق میں جنگ ہو تو اس جنگ کے کیا حدود ہونا چاہئیں یہ کہ جس جماعت سے جنگ ہو اس کے ہر متنفس کو نیست و نابود کردیا جائے یا اس میں کچھ حدود قائم ہونے چاہئیں کہ اگر جنگ حق بجانب بھی ہو تو اس جنگ کو ان حدود سے محدود ہونا چاہئے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ انسانی جنگ نہ ہوگی بلکہ وہ بربریت کا نتیجہ اور حیوانی جنگ ہوگی۔

تعجب یہ ہے کہ آج کل کی متمدن دنیا، جو تہذیب کے اندر نقطۂ عروج پر ہے، اس نے جو طریقۂ جنگ اختیار کرلیا ہے اس میں اس نے ان قیود اور مراعات کو غیر ممکن قرار دے دیا ہے اور اسمیں ان شرائط کی پابندی کرنے کا امکان نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت میں جسے دور حیوانیت کہا جاتا ہے، دنیا میں ان شرائط کی رعایت کی جاتی ہو۔ لیکن عالم تہذیب اور تمدّن کی ترقی میں جو جنگ کی صورتیں دنیا میں پیش کی جارہی ہیں، وہ ان اصول جنگ سے بالکل علٰیحدہ ہیں اور حقیقی معنوں میں ان کو حیوانیت سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ واقعی حیثیت سے جنگ جو صحیح قرار پاسکتی ہے، وہ ان میں سے کون سا طریقۂ جنگ ہے۔ دنیا میں اگر جنگ کا سب سے زیادہ یقینی درجہ حقیقت کا ہوسکتا ہے تو وہ صرف پہلا طریقۂ جنگ ہے۔ یعنی ایک دشمن ہم پر حملہ کرتا ہے اور جس وقت ہم کو اپنی زندگی کے ضائع ہونے کا خوف ہو اور ہم اتنا سامان کرلیں کہ جس سے ہماری حفاظت ہوجائے تو ہم اس کے حملہ کو رد کردیں۔ یہ وہ یقینی صورت ہے کہ جس میں میں سمجھتا ہوں کہ عقلی حیثیت سے گنجائش کلام نہیں ہے اور اس پر پہلے تبصرہ کیا جاچکا ہے کہ یہ کہنا کہ ہر موقع پر عدم تشدد اختیار کیا جائے دنیا کی فتنہ پرور جماعتوں کی ہمتیں بڑھانا ہے اور ان کے فتنہ وفساد میں اضافہ کرنا ہے۔ یہ نام کو عدم تشدد ہے۔ لیکن حقیقتاً اس عدم تشدد میں تشدد کا سرچشمہ مضمر ہے۔ اگر آپ دنیا کو کبھی ایسا بنا سکئے کہ ایک شخص دوسرے کے خلاف دست تعدی نہ

اٹھائے، اگر دنیا کو ایسا بنا سکئے کہ دنیا میں ہر شخص شریفانہ خیالات سے معمور ہو، اگر ہر انسان انسانیت کی قدر جانتا ہو، تو بیشک یہ عدم تشدد کی تلقین صحیح اور درست ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر دنیا کہنے کوتو انسانوں کی دنیا ہے لیکن اس دنیائے انسانیت میں فی صدی ۹۹ جانور بستے ہیں۔ یہ نام کو انسانوں کی آبادی تو ہے مگر حقیقتاً یہ چلتی پھرتی مورتیں ہیں انسانوں کی اور یہ بیجان مجسمے ہیں جو اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں، لیکن ان میں وہ روح نہیں ہے کہ جو انسان میں ہونا چاہئے۔ جس وقت دنیا کا یہ اندازہ ہے، جس وقت انسانوں کے صحیح حالات کا خاکہ یہ ہے، تو اس وقت میں یہ تلقین کرنا کہ ہر شخص عدم تشدد سے کام لے اور دوسرے کے مقابلے میں اگر وہ زیادتی کرے بھی تو سر جھکا دے، یہ ویسا ہی ہے جس طرح سے کہ آپ اس کی تبلیغ کیجئے کہ درندے کے سامنے انسان کو عدم تشدد سے کام لینا چاہئے۔ سانپ ڈسنے کے لئے بڑھتا ہے، تو اس کے سامنے عدم تشدد سے کام لو۔ اگر اس کے سامنے عدم تشدد آپ کا کارگر ہوسکتا ہے، تو ان انسانوں کے سامنے بھی عدم تشدد کارگر ہوسکتا ہے کہ جو انسان نما درندے ہیں۔ اگر عقلی اصول یہ بتلاتا ہے کہ شیر سامنے آتا ہے، تو اس کا مقابلہ کرو۔ اگر سانپ سامنے آتا ہے اور اس سے انسان کو صدمہ پہنچنے کا امکان ہے، تو اس سانپ کا منھ کچل دینا انسانیت کے لئے مفید ہے۔ اگر دنیا کی تمام چیزوں میں یہ قانون نافذ ہے، تو انسانوں میں بھی وہی قانون نافذ ہونا چاہئے۔ اگر اس کے خلاف کوئی قانون نافذ کیا جائے گا یا کوئی تعلیم دی جائے گی، تو وہ تعلیم حقیقتاً دنیا میں اس انسان نما حیوانیت کے اضافہ کا باعث ہوگی، وہ اس حیوانیت کے ترقی دینے کا باعث ہوگی اور یہ ہرگز انسان کی صحیح خدمت نہیں ہوسکتی۔ اس بناء پر اس قسم کے عدم تشدد کی تلقین جو حقیقی دفاع اور حقیقی حفاظت خود اختیاری سے بھی محروم کردے ہرگز صحیح نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد دوسری منزل جوابی جنگ کی آتی ہے، یعنی ایک انسان نے جو خلاف اقدام کیا تھا، ہم دوبارہ اس سے جنگ کر سکتے ہیں، اس بنا پر کہ اس نے ہم سے جنگ کی۔ یہ صحیح اور درست ہے یا نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس میں دو صورتیں ہیں پہلی صورت تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ہمارے خلاف اقدام جنگ کیا اور اب وہ اپنے ان خیالات اور ان جذبات سے جو محرک جنگ تھے اور اپنی اس خونریزی سے جس کا اس نے ہمارے متعلق ارادہ کیا تھا، باز آ گیا ہے یعنی ہمارے خلاف اس نے اس قسم کے خیالات چھوڑ دیئے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اب اپنے پچھلے اقدام پر پشیمان ہے۔ اگر اس قسم کی صورت ہے، تو ہرگز جوابی جنگ جائز اور صحیح نہیں ہوسکتی۔ اور یہ جوابی جنگ حقیقتاً جارحانہ حملہ قرار پائے گی۔ لیکن اگر اس نے ہمارے خلاف کوئی اقدام کیا اور ہم نے اس کے اس اقدام کو ناکامیاب بنا دیا لیکن پھر بھی وہ اپنے ان خیالات پر قائم رہا اور پھر بھی اپنے دماغ میں وہ آخری جنگ کا عزم رکھتا ہے اور اب بھی ہمارے خلاف جب موقع ملے اس وقت میں جنگ کے لئے آمادہ ہوجائے گا، اور تیار ہوجائے گا۔ اس وقت میں اگر جوابی جنگ کی جائے تو یہ جوابی حملہ ایک قسم کی تادیب، ایک طرح کی پیش بندی ہوگی۔ اگر دنیا میں جرائم کی سزا کا قانون درست ہے، اگر دنیا میں قصاص کا حق صحیح ہے، تو بے شک اس قسم کی تادیب درست قرار پاسکتی ہے بشرطیکہ وہ ان ہی حدود میں رہے کہ جن حدود میں مخالف کی طرف سے اقدام ہمارے خلاف ہوا ہے، یعنی فریق مخالف نے ہمارے خلاف جس حد تک اقدام کیا تھا اور جتنا صدمہ پہنچایا تھا تو ہم اس کے عوض میں اتنا ہی نقصان پہنچا دیں، تو یہ عقلی اصول سے صحیح ہوگا۔ اور یہ سزا ایسی ہوگی کہ جو دنیا کی اصلاح کے لئے ضروری ہے۔ اگر چوری کی سزا موجود ہے، اگر دنیا میں دوسرے قسم کے جرائم کی سزا موجود ہے، تو اس قسم کی جارحانہ جنگ کی، جس نے ہم کو تکلیف پہنچائی، اسی حد تک اس کو سزا دی جائے تو یہ خلاف عقل اور فطرت کی رو سے قابل اعتراض بات نہ ہوگی۔ لیکن تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی ہم سے کچھ معترض نہیں ہے، ہم سے کوئی مطلب بھی نہیں رکھتا ہے اور ہم اس پر حملہ کریں اور اس سے جنگ کے لئے تیار ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا دشوار گذار نقطہ ہے اور

ایک بہت ہی مشکل منزل ہے جس کے متعلق ظاہری طور پر ایک انسان کہہ دے گا کہ ایسی حالت میں جنگ کرنا کوئی صحیح بات نہیں ہے، لیکن واقعی اس موقع پر حد فاصل قرار دینا اور کوئی کلیہ ایسا کہ جو مختلف صورتوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ قرار دے دے کہ کن صورتوں میں جنگ درست ہے اور کن صورتوں میں جنگ درست نہیں ہے۔ یہ ایک دشوار بات ہے، دیکھنے میں۔ ایک معمولی مثال آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کھڑے ہوئے ہیں، آپ کے بازوؤں میں طاقت ہے، تلوار آپ کے پاس موجود ہے، یعنی آپ میں ہر طرح کی مقابلہ کی قوت ہے، اور آپ ایک طاقتور انسان کو دیکھئے کہ وہ ایک بچہ کو، جو کمزور ہے جس کے پاس مدافعت کی طاقت نہیں ہے، دبوچے ہوئے اس کے گلے پر چھری چلانا چاہتا ہے۔ آپ کے اوپر تو حملہ نہیں ہوا ہے۔ آپ اگر آگے بڑھئے گا، تو یہ آپ کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوگا۔ نہ مدافعت ہے، نہ یہاں فریق مخالف کی طرف سے آپ کے مقابل میں جارحانہ اقدام ہے۔ آپ کے ساتھ نہ اس نے کچھ کیا ہے اور نہ اس کا کچھ ارادہ ہے۔ آپ سے کوئی مطلب نہیں ہے، مگر عقل اور فطرت کی رو سے آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ اس بچّہ کی زندگی کی بقا کے لئے اپنی قوت سے مقابلہ کیجئے اور اس کے پنجے سے اس کو چھڑائیے۔ یہاں اگر آپ وعظ اور نصیحت پر اکتفا کیجئے تو اپنے فرض سے کیا آپ سبکدوش ہو جائیں گے۔ یہاں پر عدم تشدد سے کام لینا یا تلقین کرنا کافی ہے یا یہ کہ آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کے تشدد کے مقابلہ میں جوابی تشدد کریں اور کسی نہ کسی طرح اس کو اس ارادہ سے باز رکھیں اب اگر اس بچّے کی حفاظت کے سلسلہ میں مجبوراً آپ کی تلوار نے اس ظالم انسان کی جان بھی لے لی اور اس کو مار بھی ڈالا تو کوئی شخص آپ کو قابل ملامت نہ سمجھے گا۔ میں تو کہہ چکا ہوں کہ حقیقتاً ایسے انسان کو انسان نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگر سانپ انسان کے پیر میں کاٹنے کے لئے دوڑ رہا ہو اور آپ کے ہاتھ میں لکڑی ہو تو آپ کا فرض ہے کہ آپ اس سانپ کو مار ڈالئے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اس ظالم انسان کے اس خط وخال سے جو انسان سے مشابہ ہیں دھوکا نہ کھانا چاہئے بلکہ اس بے گناہ کی حفاظت کے لئے آپ ایک ایسی مخلوق کو جو ایک بے گناہ کو فنا کرنا چاہتی ہے، اگر راستہ سے ہٹا دیں تو بیجا نہ ہوگا، بلکہ اپنے اس اقدام سے آپ انسانیت کی خدمت انجام دیں گے۔ اب اس صورت میں کیا آنکھ بند کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جارحانہ جنگ کرنا ہر موقع پر فطرت کے اعتبار سے اور قانون کے اعتبار سے ناجائز ہے اور کوئی مجھے سمجھا دے اتنا کہ یہ اقدام مدافعت کے تحت میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ میں آپ کے سامنے گویا ایک یہ کلیہ بنا رہا ہوں کہ جو بچہ سامنے ہو اور اس کے گلے پر چھری پھر رہی ہو تو اس کی جان کی حفاظت کرنا آپ کے اوپر فرض ہے۔ یہ تو ایک مثال تھی کہ عام انسانی جذبات کے لحاظ سے ہر ایک شخص متاثر ہو کر اس کا اقرار کرے کہ حقیقتاً یہ موقع ایسا ہے کہ اس ظالم انسان کو اس کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے لیکن کیا انسان کی جان ہی قابل حفاظت ہوسکتی ہے؟ اگر ایک شریف خاتون کی کوئی برسرراہ عصمت دری کرنا چاہتا ہے اور وہ آپ سے فریاد کر رہی ہے، تو کیا رائے ہے اس موقع پر؟ اگر اس کی آبرو کی حفاظت کے ذیل میں اس ظالم کو کوئی آپ کے ہاتھ سے گزند پہنچ جائے، تو کوئی قابل اعتراض بات ہوسکتی ہے؟ یہ کیا ہے؟ حفاظت جان بھی تو یہاں پر نہیں ہے۔ اگر یہاں جان عام انسانی اصول کی بنا پر آبرو کے برابر یا اس سے کم ہے تو اس وقت اس کو قتل کر ڈالنے میں بھی آپ مورد الزام نہیں قرار پاسکتے، اس لئے کہ بسا اوقات آبرو جان سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے ایسے موقعوں پر آپ کو عقل اور انسانیت کی طرف سے فتویٰ ملے گا کہ اس موقع پر بیشک اپنی طرف سے کوتاہی کرنا حفاظت میں جائز نہیں ہے، جب کہ منع کرنے پر کام نہیں چل سکتا ہے، تہدید کرنے سے کام نہیں چل سکتا ہے، تو ایسی صورت میں آگے نہ بڑھنا خلاف فطرت ہوگا۔ لیکن صورت مفروضہ وہی ہے، جب یہ پست درجے ناکام ثابت ہوں، جب ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہ

حاصل ہوتا ہو، تو ایسے وقت میں اقدام درست ہوگا۔ میں نے آپ کے سامنے دوسری جو مثال پیش کی یعنی ایک شریف خاتون کی آبروریزی تو اب شاید آپ کو کلیہ بنانا آسان ہوگا یعنی ہر وہ چیز جو انسانیت کے نقطۂ نظر سے قابل حفاظت ہو اگر اس کو کسی فرد یا کسی جماعت کے ہاتھوں سے نقصان پہنچ رہا ہو، تو ایسے وقت میں انسان کا انسانی حق ہے کہ وہ اس قابل حفاظت چیز کی حفاظت کے لئے اقدام کرے، مگر یہ وہ نقطہ ہے کہ جہاں حق و باطل دونوں آ کر مل جاتے ہیں اور تفرقہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ آب اور سراب، حقیقت اور مجاز انسان کے سامنے آ کر انسانی نگاہ امتیاز کو غلط فریبی میں مبتلا کر دیتے ہیں یہاں آ کر پھر حق و باطل میں تفرقہ مشکل محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک کوئی مقصد قابل عزّت ہو، قابل حفاظت ہو اور وہی مقصد دوسرے کے نزدیک قابلِ حفاظت نہ ہو، تو یہاں آراء و نظریات میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ کوئی کہے گا کہ صحیح ہے، کوئی کہے گا غلط ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ ہم کو جارحانہ جنگ میں یعنی وہ جو پہلے معیار کی بنا پر جارحانہ قرار پاتی ہے، اس میں یہ تفریق قرار دینا ضروری ہے اور بغیر اس کے دنیا کا نظام درست نہیں ہو سکتا اور بغیر اس کے انسان کے جو عام اصول ہیں وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔ اب جس قسم کی جنگ ہو، خواہ دفاعی یا جوابی یا جارحانہ (جبکہ بلند مقاصد کے لئے وہ ضروری ٹھہرتی ہو)، تو اس جنگ کے حدود کیا ہونے چاہئیں۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ کبھی گناہگار کی زد بے گناہ پر پڑنا درست نہیں ہے یعنی اگر کوئی جماعت مفسدہ پرداز ہے یا جنگ کے لئے تیار ہے یا صدمہ پہنچاتی ہے کسی بلند مقصد کو تو اس جماعت میں یہ تفرقہ قرار دینا لازمی ہے کہ ان میں سے کون وہ ہیں جو اس کے ذمہ دار اور کون وہ ہیں کہ جو اس کے ذمّہ دار نہیں ہیں؟ یعنی ایک جماعت آپ سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہے، اس کے مردوں کو قتل کر ڈالا مگر اس جماعت کی عورتوں نے کیا قصور کیا ہے اور آپ کا اس طرح سے حملہ کرنا کہ کوئی بھی متنفس باقی نہ رہے، جتنے ہیں وہ سب کے سب فنا ہو جائیں، بلکہ یہ ممکن ہے کہ جو مجرم ہیں، وہ بچ جائیں اور جو بے گناہ ہیں، وہ تباہ ہو جائیں۔ گولے برسنے میں کیا ہوتا ہے فوج کی چھاؤنیاں تو بچ جاتی ہیں مگر اسپتال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ صاحبان طاقت وقوت سپاہی خندقوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں اور امن پسند شہری جو اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، ان کے چھپانے کے لئے خندقیں بھی کارگر نہیں ہوتی ہیں، وہ مر جاتے ہیں۔ اسی لئے تو یہ کہا جاتا ہے کہ جس کو دنیا میں انسانیت کی ترقی کہا جاتا ہے، وہ نظر کا دھوکا ہے۔ حقیقتاً انسانیت گرتی جاتی ہے اور تمدّن و تہذیب پستی میں جا رہے ہیں لیکن دنیا والے کہتے ہیں کہ تمدّن ترقّی کر رہا ہے اور روشنی کا زمانہ ہے مگر انسانیت کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر اس طرح کی جنگ جس میں مجرم اور غیر مجرم میں امتیاز نہ ہو سکے، ایسی جنگ جس میں گنہگار کے ساتھ بے گناہ بھی ختم ہو جائیں، ایسی جنگ کہ جس میں قابل جنگ اور نا قابلِ جنگ کی تفریق نہ ہو سکے، نص کی رو سے کبھی درست نہیں ہو سکتی۔ اس طرح حملہ کرنا کہ جس سے شہر برباد ہو جائیں، جس سے عورتیں، بچے مرد خواہ وہ بیمار ہوں خواہ وہ صحیح ہوں، وہ سب ہی شکار ہو جائیں۔ اس طرح کی جنگ انسانیت کی رو سے درست نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کو بربریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن بربری لوگوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ بربریت کے بجائے ہٹلریت یا مسولونیت کے الفاظ کا استعمال ہو اور بربریت کے لفظ کو لغت سے نکال دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا اور یہ وہی طریقۂ جنگ ہے کہ جس کو قانونِ فطرت روا نہیں رکھتا۔ اب یہ اصول، جو آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، ان تمام اصول کی روشنی میں آپ مذہبی تعلیمات کا بھی جائزہ لے سکتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اس سے کہاں تک مطابق ہے اور کہاں تک مخالف؟ اس کے بعد ان لڑائیوں کی نوعیت بھی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی جو اسلام کی تاریخ میں آپ کی نظر کے سامنے آتی ہیں۔

❁❁❁